Ahmad Mushtaq:A poet in quest of civilization Traces

احمد مشتاق:تہذیبی آثار کی جستجو کا شاعر

Dr.Asad Abbas Abid *[1]
Lecturer, Department Of Urdu, University Of Sargodha
Dr.Muhammmad Kamran Shehzad*[2]
Lecturer, Department Of Urdu,University Of Sargodha

ڈاکٹر اسد عباس عابد☆[1]
لیکچرار،شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا
ڈاکٹر محمد کامران شہزاد☆[2]
لیکچرار شعبہ اردو ، یونیورسٹی آف سرگودھ، ا

Correspondance: asad.abid@uos.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received:01-08-2025
Accepted:24-09-2025
Online:29-09-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Ahmad Mushtaq is a remarkable name in the tradition of modern Pakistani urdu ghazal.His creative sensibility is deeply engaged with cultural memory and civilizational heritage.His poetry reveals a constant search for historical consciousness,collective identity,and the symbolic remnants of tradition in the face of modernity.Ahmad Mushtaq constructs a poetic discourse by weaving together the classical references,cultural traits and existential concerns that not only preserves but also reinterprets the legacy of civilization.This study is an attempt to highlight how his work negotiates the tension between tradition and modern thought,thereby creating a meaningful dialogue between past and present..

KEYWORDS:Ghazal, Culture, tradition, civilization, Traits.

قیامِ پاکستان کے بعد مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد پاکستان میں جدید غزل کا جو رُوپ ہمارے سامنے آتا ہے اُس میں تین بہت اہم ہیں ناصر کاظمی، منیر نیازی اور شہزاد احمد۔ ان تینوں شاعروں نے غزل کے مروجہ خارجی نظام میں تبدیلی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں، اور روایت کے ساتھ بھی خوب نبھاہ کی ہے۔ اس نئے لہجے کی غزل نے دیگر تجربوں کے ساتھ ساتھ بہت سے منفرد استعارے بھی متعارف کروائے، جس باعث ُپاکستان کے اندر لکھی جانے والی غزل بالکل ایک منفرد اور اثر انگیز لہجے کی حامل بن گئی۔ اس روش اور نئے پن نے اردو غزل کو کئی طرح کے استعاروں سے نجات بھی دلائی، جس باعث غزل ایک نئے اسلوب میں ڈھل گئی اور اس میں بات کرنے کے نئے امکانات پیدا ہو گئے۔ اس عہد میں اس طرح کی جدید غزل کے لہجے میں اتنی توانائی تھی کہ ایک پوری نسل نے اس نئے روپ کو اپنانے کی کوشش کی۔

یہ بات اور بھی حیران کن ہے کہ بالکل اسی نئے عہد میں، نئے اسلوب میں، نئے امکانات میں، نئے استعاروں میں ایک نام کس قدر خاموشی سے ایک اور نئے انداز سے غزل تخلیق کر رہا ہے۔ یہ نام اردو غزل کا معروف نام احمد مشتاق کا ہے، جن کے حوالے سے یہ رائے بھی دی گئی کہ اُن کی غزل میر تقی میرؔ اور ناصر کاظمی سے متاثر ہے۔ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق دونوں جدید اردو غزل میں فطرت سے وابستگی اختیار کرتے ہوئے اپنی آمد کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ناصر کاظمی کے ہاں یادِ ماضی کا نقش گہرا بھی ہے اور کسیلا بھی، لیکن احمد مشتاق نے جدید حسیت کے بل بوتے پر غزل میں جدید امتزاج کا رنگ ابھارا، جس میں بہت تنوع، جدت اور ندرت ہے، وہ ماضی کو بیان کرتے ہوئے ایک الگ طرح کا نقش قائم کرتے ہیں جس میں فسادات کی شدت سے زیادہ انسانوں سے وابستہ رونقیں، آوازیں، گھر، شہر سنسان ہونے کی آہٹ سنائی دیتی۔ احمد مشتاق بھی ناصر کاظمی اور شہزاد احمد کی طرح ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئے بلکہ شہزاد احمد اور احمد مشتاق میں دو تین قدریں مشترک بھی ہیں کہ دونوں امرت سر سے ہجرت کر کے آئے اور دونوں کا تعلق کشمیری خاندان سے ہے شہزاد احمد قیامِ پاکستان سے تین دن بعد ہجرت کر کے آئے تو احمد مشتاق ایک مہینہ بعد آئے۔ دونوں لاہور میں قیام پذیر ہوئے اور دونوں حلقہ اربابِ ذوق سے منسلک رہے لیکن دونوں کی غزل پر کسی نظریہ اور تحریک کا رنگ غالب نہیں ہے۔ میر تقی میرؔ کی غزل اور ناصر کاظمی کی غزل میں جو اداسی کے رنگ پنہاں ہیں وہ رنگ ہمیں احمد مشتاق کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ بلکہ ناصر کاظمی نے خود احمد مشتاق کی شاعری کے بارے میں ایک جملہ کہا:

> "میں جب تازہ غزل کہتا ہوں تو میرؔ کو بھی سنتا تاہوں اور احمد مشتاق کو بھی"[1]

ناصر کاظمی، شہزاد احمد، منیر نیازی اور احمد مشتاق ہجرت کے تجربے سے گزرے اور تینوں شاعروں نے اس کرب کو اپنے اپنے نقطہ نظر سے سمجھا اور بیان کیا۔ قیام پاکستان کے بعد شعرا کی ایک پوری کھیپ ہے جن کے ہاں اس ہجرت پر اظہارِ

تاسف ملتا ہے فیض نے "داغ داغ" اجالا کہا تو ناصر کاظمی نے بستی کو جنگل اور رات سے تشبیہ دی۔ احمد مشتاق نے اپنی اداسی کو یادِ ماضی، تلاش، تنہائی، شور، آواز، مکان، مکین، گلی، دروازہ، کمرہ، جیسے استعارات سے مزئین تو کیا ہے لیکن پھر بھی ہجرت کرنے پر پُر شکوہ نظر نہیں آتے۔ وہ ہجرت کے مصائب سے زیادہ ان رشتوں کی کھوج میں ہیں جن کی بدولت ان کے ہاں رونقیں تھی گلی کوچے آباد تھے، گھر کمرے دروازے آباد تھے۔ جدید غزل کے موضوعات کو اگر سامنے رکھیں تو یہ ہجرت کا ایک تیسرا رخ ہے جو ہمارے سامنے احمد مشتاق کی شاعری کی روپ میں سامنے آتا ہے۔ پہلا رخ وہ ہے جس میں خونی مناظر، اموات، لٹنے اور اجڑنے کا براہِ راست مشاہدہ شامل ہے، دوسرے رخ میں ہمارے سامنے شعرا کی وہ کھیپ ہے جنھوں نے یہ صدمہ سہا اور اس پر اظہارِ تاسف کیا، اس کے بعد بھی ہجرت کے حوالے سے ایک تیسرا رخ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے وطن میں رہتے ہوئے ہجرت کے بعد ہجرت کا تصور جس سے انسان کو ہمہ وقت گزرنا پڑتا ہے، وطن میں رہتے ہوئے بے وطنی کا تصور، یہ بے وطنی کا تصور جدید غزل کی موضوعاتی تبدیلی ہے۔ اصل می اس موضوع کی غزل میں بازگشت بہت زیادہ تھی وہ شعرا جو اس سانحے سے براہ گزرے تھے وہ اس موضوع کو بار بار دہرا رہے تھے، لہٰذا یہ نظریہ ابھارا کہ اس موضوع کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا جائے۔ احمد مشتاق کے ہاں ہجرت کے حادثے سے گزر جانے پر ایک تلاش کا احساس ملتا ہے وہ اس حادثے میں کسی مادی چیز کے کھو جانے کا ماتم نہیں کرتے نہ ہی براہِ راست اظہارِ افسوس ہے بلکہ وہ ایک منفرد انداز میں اپنے جذبات کے قتل ہو جانے کا اظہار کرتے ہیں نبی احمد لکھتے ہیں۔

> "احمد مشتاق کے ہاں ہجرت کا تجربہ بڑے منفرد انداز میں سامنے آتا ہے۔ وہ ناصر کاظمی کی طرح راہزنوں سے مسافروں کے لٹ جانے کا ذکر کرتے ہیں اور جب ہم سوچتے ہیں کہ اس مسافر کا راستے میں کیا لٹا ہے تو ہمیں کچھ مادی سامان نظر نہیں آتا بلکہ اس کے جذبوں کے لٹ جانے کا احساس ہوتا ہے کہ پردیس کے سفر میں اس کے جذبے لٹ گئے۔"[2]

ان جذبوں کے لٹ جانے کا گہرا احساس ہمیں احمد مشتاق کی شاعری میں نظر آتا ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ ان کی شعری کائنات میں مکان، گلیاں، کھڑکیاں، دروازے انسانی آوازوں سے آباد ہیں وہ آوازیں جب گم ہوتی ہیں تو اس کے مختلف رنگ ان کی احساس طبیعت میں ایک دائرے کی طرح پھیلتے ہیں۔ یہ آواز نہ تو کسی سے مخاطب ہے اور نہ خود کلامی کی آواز ہے بلکہ یہ زخموں کی آواز ہے جو جذبات سے مخاطب ہے۔ تشدد کی شعریات میں وہ مبالغہ آمیزی یا مہملیت کی طرف نہیں جاتے بلکہ ے تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے ماحول کے راوی ہیں۔ انھوں نے اپنے جذبات کو مختلف دائروں میں تقسیم کیا تاکہ اس کی تفہیم کی کئی جہتیں نکلیں۔ یہ دائرے ہمیں اپنی اپنی فہم اور شعری تربیت کا احساس دلاتے ہیں۔

اب وہ گلیاں وہ مکاں یاد نہیں

کون رہتا تھا کہاں یاد نہیں
جلوہ حسن ازل تھے وہ دیار
جن کے اب نام ونشاں یاد نہیں[3]

مکانوں میں یہ انخلا کا عمل انھیں تنہائی کے ایک شدید خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔یہ عمل انھیں مسلسل ایک تلاش میں لگائے ہوئے ہے اور یہ تلاش ایک شخص کی بھی ہے اور ایک عہد کی بھی ہے،اس سے آگے بڑھ کر دیکھیں تو ایک تہذیب کی بازیافت کی شعوری کوشش بھی۔یہاں ماضی کو یاد کرنا اپنی ذات کی تلاش ہے جس میں مختلف تلازمات مل کر پورا ایک ماحول پیش کرتے ہیں۔یہی ماحول احمد مشتاق کے ہاں ایک منفرد غزل کہنے کا غماز بھی ہے۔جدید غزل کا سماجی تصورِ محبوب جس میں محبوب اور محبوب سے وابستہ تصورات میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔یہاں محبوب کے در پر کھڑے ہونے کی جرات محب پر غالب ہے بجائے کہ محبوب کے بام پر آنے کا انتظار کیا جائے بلکہ احمد مشتاق کے ہاں تو مکان کے اندر بھی محبوب کو دیکھنے کا سلیقہ اور تقاضا موجود ہے۔بقول ضیا فاطمہ:

"وقت کے ساتھ مشتاق کے یہاں مکان کا ذکر بار بار آیا ہے جو استعاراتی حیثیت رکھتے ہیں،لیکن اس سے پہلے وہ سادے برجیوں،کھڑکیوں اور دالانوں والے مکان ہیں جو گلیوں کے بیچ کھڑے ہیں:

سونے دالان کھڑکیاں سنسان۔۔خالی کمرے مکان کے دیکھے جس کی سانسوں سے مہکتے تھے در و بام ترے۔۔اے مکان بول کہاں اب وہ مکیں رہتا ہے۔قدیم عشقیہ شاعری میں مکان کا ذکر کثرت سے ہوا ہے لیکن قدما نے اکثر و بیشتر مکان کو ڈیوڑھی اور بام تک محدود کر دیا ہے۔مکان کے اندر قدم رکھنے کی جرات کسی میں نہ ہوئی۔اب وقت اور تہذیب دونوں بدل گئے ہیں۔پہلے محبوب کو بام پر دیکھا جا سکتا تھا لیکن مشتاق نئے دور کے عاشق ہیں وہ بام سے اتر کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کوئی ڈر محسوس نہیں کرتے۔"[4]

مکانوں کے ساتھ یہ وابستگی پوری ایک داستان ہے،جس کے مختلف طرح کے لوازم احمد مشتاق کی شاعری کا لازمی جزو ہیں وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے اصل مرکز کو یاد کرتے ہیں۔مکانوں کے مکینوں کی عدم موجودگی ان کی زندگی کا ایک سلگتا ہوا دُکھ ہے۔وہ ایک ایسے فقیرِ بے نوا ہیں جو خاموشی سے اسبابِ سفر اٹھائے ہوئے ان مکانوں کے ارد گرد دبی آوازوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔مکان اور شہر بعض اقات دونوں استعارے مل کر ایک ایسی بستی کا تصور پیش کرتے ہیں جو جس میں

شہر اپنی رونق، گہما گہمی، شور، آوازوں، روشنیوں سے محروم ہیں اور مکان مکینوں کی آوازوں سے محروم ہیں بلکہ مکانوں کے اندر سے پیدا ہونے والی یہ تنہائی اور اداسی کھڑکیوں سے بھی جھانکتی ہے، دیواروں سے ٹکراتی ہے، دروازوں میں منہ چھپائے روتی ہے اور خاموش شہر کی خاموش گلیوں میں دور تک لڑکھڑاتی چلی جاتی ہے۔ اس شہر اور اس مکان کے اوپر برسنے والی چاندنی بھی بہت سہمی ہوئی ہے کیوں کہ اس چاندنی کا استقبال کرنے والا شہر خود اداس، ہجر سے سہاہوا اور اپنوں سے دور بیٹھا ہوا ایک شخص ہے جو پریوں کے دیس میں جا کر اپنے لوٹ آنے کا منتظر ہے۔

چلے ہو دیکھنے مشتاق جن کو پچھلی رات
وہ لوگ شام سے دروازہ بند رکھتے ہیں5

ان مکینوں کو مکاں روتے ہیں
جو انھیں پھر نہ بسانے آئے6

انھیں گلیوں میں کھلتے تھے ملاقاتوں کے دروازے
انھیں گلیوں میں چلتی ہیں ہوائیں شام ہجراں کی7

مندرجہ بالا تینوں اشعار میں ایک تصور بنتی ہے جس میں مکانوں کے دروازے لوگ شام سے ہی بند کر دیتے ہیں، مکانوں کو مکین روتے ہیں اور ان مکانوں کو بسانے والے مکین نہیں لوٹ رہے، مکیں ہیں کہ وہ خود ان مکانوں کی یادوں میں نڈھال ہیں جو ان کے حافظے میں موجود ہیں۔ اور وہ گلیاں جو شاعر کے حافظے میں ایک خوبصورت یاد کی صورت میں محفوظ ہیں جس میں شاعر کا پورا بچپن اور جوانی بسی ہے ایام جوانی کی خوبصورت یادیں ہیں جن میں ملاقاتوں کے دروازے کھلتے تھے ان گلیوں میں اب سرِ شام ہجر کی سرد ہوا چلتی نظر آتی ہے۔ مکان، گلیاں، دروازے، کھڑکیاں ان کے جذبات کی ایک ایسی استعاراتی زبان ہے جس کو استعمال کرنے میں شاعر کی فکری ریاضت شامل ہے۔ انھوں نے اپنے اپنے اندر بسی تنہائی اور ویرانی کی تصویر سامنے لانے کے لیے مخصوص طرح کے استعارے استعمال کیے ہیں۔ ان استعاروں کا استعمال جدید غزل کی زبان میں رائج ہے کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن احمد مشتاق کے ہاں ان استعاروں نے ایک مخصوص طرح کے جذبات کی ادائیگی کی ہے۔ احمد مشتاق کے ہاں ایسے لفظوں کے برتاؤ کے بارے میں انیس اشفاق لکھتے ہیں۔

"دوسری علامتوں میں احمد مشتاق کے یہاں گھر اور اس کے متعلقات کا استعمال بھی بہت زیادہ ہوا ہے۔ ان متعلقات کے ذریعے احمد مشتاق نے گزرے ہوئے زمانوں کی یاد اور معدوم ہوتے ہوئے آثار کا ملال ظاہر کیا ہے۔ نیز ان کے ذریعے ہجرت اور بے گھری کے مفہوم بھی ادا کیا ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

سونے دالان کھڑکیاں سنسان
خالی کمرے مکان کے دیکھے

بہت رک رک کے چلتی ہے ہوا خالی مکانوں میں
بجھے ٹکڑے پڑے ہیں سگرٹوں کے راکھ دانوں میں

مکانوں کے یہ منظر ایک پوری داستان بیان کر رہے ہیں۔ راکھ دانوں میں سگرٹوں کے بجھے ٹکڑے یہ بتا رہے ہیں کہ ان مکانوں میں لوگ رہتے تھے لیکن اب نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ لوازم۔ صرف ان کے آثار ہیں جو ان کے ہونے کی گواہی دے رہے ہیں۔ خالی مکانوں میں ہواؤں کا رک رک کے چلنا اس وحشت میں اور اضافہ کرتا ہے جو خالی مکانوں کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ احمد مشتاق کے یہ مکان ان مکینوں کی یاد دلاتے ہیں جو کبھی ان مکانوں میں رہتے تھے۔"8

احمد مشتاق کے ہاں مکان کے حوالے سے ایک اور رنگ بھی نظر آتا ہے اور وہ رنگ اس شخص کا ہے جس کو اردو شاعری کی روایت میں محبوب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس رنگ کو بیان کرنے میں ان کے کا حزنیہ انداز سامنے آتا ہے کیوں کہ وہ اس شخص کو ان مکانوں اور گلیوں میں نہ پا کر بہت اداس اور اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی نسبت سے انھیں اپنے علاقے اور گھر کی یاد ستانے لگتی ہے اور پھر اس حوالے سے کچھ گلیاں اور مکان بھی ان کی یادوں میں محفوظ ہیں جن کا ذکر وہ اسی محبوب کی ہستی کے حوالے سے کرتے ہیں۔ انھیں گلیوں اور مکانوں میں وہ اپنے بچپن کے دن جوانی کے دن اور سرد موسموں میں کھیلتے رہنے کے دن یاد کرتے ہیں۔ اب اس مقام پر وہ کسی شخص کو بے وفا ہونے کا الزام نہیں لگاتے بلکہ اپنے اس احساس کو ثقافتی رنگ میں بدل میں دیتے ہیں مکانوں اور مکینوں کے رشتوں کو بیان کرنا ایک طرح کا زمانی اور مکانی اظہار ہے جس سے وہ اپنا ایک مخصوص رنگ بنانے میں کامیاب ہوئے۔ انسان جتنا بھی تہذیبی ہو لیکن پھر بھی اس کی زندگی میں کچھ خاص لوگوں کی خاص اہمیت ہوتی ہے اور پھر شعری روایت میں محبوب بہت سارے اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ محبوب کی مناسبت سے کائنات کے بہت سارے عوامل سے انیست ہوتی ہے لگاؤ ہوتا ہے۔

اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے9

کسی کا کہیں رہنا اور کسی کا کہیں رہنا احمد مشتاق کا دکھ ہے وہ اپنے محبوب نظر لوگوں کو رشتوں کو ایک جگہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس زمانے میں رہنا چاہتے ہیں جب سب ایک جگہ رہتے تھے۔ اب اسی دکھ کا اظہار وہ مکان کے علاوہ "گلی" کے استعارے سے بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک شہر خیال ہے جو ان کے حافظے میں سُلگتا نظر آتا ہے اس کے مکان ویران اور سُونے ہیں اس کی گلیاں بے رونق ہیں تو کبھی بے آواز یہ اس ایک ایسے شہر بے مثال کے آثار ہیں جو احمد مشتاق کبھی بھی بھلا نہیں پائے کبھی تو وہ اس گلی میں خود کو کھیلتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور کبھی یہاں کسی کے قدموں کی چاپ انھیں اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوتی ہے۔

گم ہے انھیں گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا
یہ جھانکنا یوں ہی تو نہیں دربدر اپنا10؎

ٹھنڈے موسم میں پکارا کوئی ہم آتے ہیں
جس میں ہم کھیل رہے تھے وہ گلی یاد نہیں11؎

انھیں گلیوں میں کھلتے تھے ملاقاتوں کے دروازے
انھیں گلیوں میں چلتی ہیں ہوائیں شام ہجراں کی12؎

مکان اور گلی کی مناسب سے ایک پورا ماحول احمد مشتاق کی شاعری میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اس کا ایک تیسرا رخ لوگوں کی آوازوں کا آنا یا شور آنا بنیادی طور پر یہ بھی اُن کے ہاں ایک تلاش ہے۔ مختلف آوازوں کا آنا بھی ایک طرح کا اضطراب، بے چینی، اور خلفشار کی علامت ہے۔ سکون کا میسر نہ ہونا ایک حوالے سے دل ودماغ کے اندر جو کشمکش پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کرتا ہے۔ اس صورت حال میں دل کا شور سنائی دیتا ہے۔ تو کبھی فطرتی آوازیں بھی کسی کے قدموں کی آہٹ سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ کبھی پتوں کی سنسناہٹ کبھی بارش کی آواز، کبھی سمندر کی لہروں کی آواز، کبھی ماضی کی یادوں کا شور یہ مختلف شور ہیں جو ان کی یادوں میں بسے مکانوں اور گلیوں سے اٹھتے ہیں۔ احمد مشتاق کے ہاں یہ شور ایک فلسفیانہ انداز اور حساسیت کی بنیاد پر بہت اثر انگیز تاثر رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا ادراک ہے جو منفرد مفاہیم پیدا کرتا ہے اور مکانوں اور گلیوں کی رونقوں کو یاد کروانے میں معاون بھی ہے۔

ایک رومانوی شاعر زندگی کے مختلف ادوار سے گزر رہا ہوتا ہے جب مسلسل تنہائی اور مسافرت زندگی کا مقدر ٹھہر جائے تو ایک زاویہ یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان تمام طرح کی آوازوں سے بھاگنا چاہتا ہے اور ایک ایسا مکان آباد کرنا چاہتے ہیں جہاں پر کوئی صدا نہ آئے۔ احمد مشتاق کے ہاں دونوں رویے سامنے آتے ہیں کبھی تو وہ ان آوازوں کو یاد کرتے ہیں اور بے چین نظر آتے ہیں تو کبھی ان آوازوں سے منہ موڑ کو اپنی ذات میں سمٹنا چاہتے ہیں۔ یہی آوازیں ان کے سکون کو تباہ کرتی ہیں کیوں کہ وہ آوازوں کی مدد سے ان اشخاص کی کھوج میں ہیں جو کھو گئے ہیں تو یوں وہ خاموش رہ کر بھی ان اشخاص کو یاد کرتے ہیں اور مختلف آوازوں کی مدد سے بھی ان کو یاد کرتے ہیں۔

چلو ایسا مکاں آباد کر لیں
جہاں لوگوں کی آوازیں نہ آئیں13؎

بعض اوقات وہ دنیا کے ہنگاموں سے اس قدر بے زار اور تنگ نظر آتے ہیں کہ انھیں اپنے اندر کی آواز سننا بھی مشکل نظر آتا ہے، بلکہ یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ وہ اپنی آواز سن پائیں۔ آوازوں سے بھری ہوئی دنیا کا یہ کیسا المیہ ہے کہ کبھی انسان کچھ آوازوں کو پسند کرتا ہے اور کچھ آوازیں اس کے لیے تکلیف کا سبب ٹھہرتی ہیں۔ اردو شاعری کے ارتقا کو دیکھیں

تو ایک سطح پر تو وہ تہذیبی رویہ ہے جس میں کوئل کی پکار ہے، بلبل کی صدا ہے، پپیہا بولے تو ساون کی آمد کی اعلان ہے، محبوب کی سرگوشیاں ہیں، ندی اور نالے کی آواز ہے بادل اور بجلی کی گرج چمک ہے یہ سب وہ آوازیں ہیں جو آج کے ہنگامہ خیز دور میں دبی ہوئی آوازیں ہیں ان کی جگہ پر برقی آلات اور مشینی دور آچکا ہے ان آلات اور مشینوں کی آوازوں نے جدید غزل کے شاعر کو متاثر کیا ہے۔ احمد مشتاق کا شمار بھی اسی جدید غزل کے شاعروں میں ہوتا ہے۔

احمد مشتاق نے فطرت کے خوبصورت اور مضبوط رشتے کی پناہ میں محبوب کو یاد کرنے کی بجائے بڑھتی ہوئی آباد کے سروکار سے مکانوں اور گلیوں کی تہذیب میں چھپے اس شور کو محسوس کیا ہے جو بہت سے رشتوں سے منسوب ہے۔ وہ اجتماعی تہذیب کی بازیافت کا شعوری حربہ استعمال کرتے ہیں جس میں وہ انفرادی سوچ سے نکل کر اجتماعیت کا زائچہ بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

چونک اٹھتے ہیں اونگھتے دریچے
وہ شور نہیں رہا گلی میں 14ؔ

پچھلی تہذیب سے وابستہ اشخاص جب نئے زمانے میں شامل ہوتے ہیں تو وہ آلاتی اور مشینی آوازوں سے گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں احمد مشتاق کی شاعری میں آوازوں کا آنا ایک پورے سمعی نظام کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ آوازیں ایک طرح سے کلیدی کردار ادا کرتی ہیں اس نظام کو سمجھنے میں جس میں مکان اور گلی زندگی کی علامتیں ہیں۔ اب وہ زمانہ ہے جس میں یہ لوگ بہت سی آوازوں کو اور بہت طرح کی آوازوں کو پسند تو نہیں کرتے لیکن پچھلے زمانے کی یادوں کی کسک کو محسوس کرنا پسند کرتے ہیں۔ پچھلے موسموں کی صدا پر کان دھرنا چاہتے ہیں۔ اپنے خیال کی ایک ایسی دنیا بسانا چاہتے ہیں جس میں آواز فطرت کی غمازی تو کرتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی ایک بہت بڑی پیش کش ہے آواز۔ یہ آوازیں احمد مشتاق کی شاعری میں مایوسی پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ اس سے زندگی کی ایک تحریک پیدا کرتے ہیں۔ یادوں کی کتابِ مقدس میں آواز کی موجودگی ان کے ہاں بچھڑ جانے والوں کا نوحہ ہے جس سے کبھی تو ہشاشیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور کبھی دل گرفتگی کی کیفیت۔

ہوا چلتی ہے پچھلے موسموں کی
صدا آتی ہے ان کو بھول جائیں 15ؔ

اردو شاعری کی روایت میں ایک اور اہم استعارہ "کھڑکی" یا "دریچہ" کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ استعارہ ایک طرح سے امید اور آزادی کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یا دنیا کے مشاہدے یا خودی کی تلاش کے طور پر۔ کھڑکی یا دریچہ عام طور پر اندرونی دنیا جس میں انسان کے جذبات اور خیالات شامل ہیں سے لے کر بیرونی دنیا جس میں حقائق، معاشرت اور سماج

ہے ان کے درمیان ایک طرح کا وسیلہ ہے۔احمد مشتاق کے شاعری میں یہ استعارہ اس شعری فضا کو مضبوط کرنے کا ایک اور حوالہ ہے جس میں مکان، گلی، آواز جیسے عناصر شامل ہیں۔وہ اس استعارے کو یوں پیش کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے وہ ایک شہر کے خاموش اور اداس سیاح ہیں جس کے یادوں میں کچھ شہر آباد ہیں اس شہر کے مکان ہیں مکانوں کے اندر رونقیں ہیں کچھ چہرے ہیں کچھ لوگ ہیں کچھ آوازیں ہیں جو کھڑکیوں سے جھانکتی ہیں گلیوں میں دور تک یہ آوازیں بکھری نظر آتی ہیں۔یہ سیاح دور سے کھڑا ہو کر اس شہر کے مکانوں، کھڑکیوں اور دریچوں کے کھلنے کا انتظار کرتا ہے۔

بلکہ بعض اوقات تو وہ کھلی کھڑکیوں کو ہی یاد کرتے نظر آتے ہیں۔جن سے اس ویران مکان کے اندر دھوپ پڑتی محسوس ہوتی ہے۔دھوپ کا کھڑکیوں سے یوں پڑنا اور کھڑکیوں اور دریچوں کا کھلا رہ جانا مکمل طور پر احساس دلاتا ہے کہ یہاں وقت اپنی پوری تابناکی سے گزرا ہے دن گزرنے کا احساس ہوتا ہے۔کھلی کھڑکیوں سے دھوپ کا پڑنا بہت سے زاویے رکھتا ہے جس میں وقت کا گزرنا، زندگی کی علامت، مکینوں کا آباد ہونا، شہر کا بساؤ، انسان کی اندرونی کیفیات کا روحانی اظہار ۔یہ سب علامتیں کھڑکی اور دریچہ کی وساطت سے پیش کی جاتی ہیں۔

وہ کھلی کھڑکیاں مکانوں کی
وہ دوپہریں وہ کوئے یار کی دھوپ 16؎

نئے مکانوں کے دریچے احمد مشتاق کو اداس بھی کرتے نظر آتے ہیں کیوں کہ ان مکانوں کے مکین وہ نہیں ہیں جو آج تک ان کے حافظے میں محفوظ ہیں۔وہ نئے مکان سے ایک پوری نئی تہذیب کو مراد لیتے ہیں جس میں نہ صرف مکین بدلے ہیں بلکہ پورا ایک نظامِ اقدار بدلا ہے جس کے حاصلات پر وہ اظہارِ افسوس تو نہیں کرتے مگر ایک کسک ضرور محسوس ہوتی ہے جس سے مراد یہی ہے کہ وہ اپنے حافظے میں بنے پرانے مکان میں رہنا پسند کرتے ہیں جس کا وجود یقیناً ماضی سے تعبیر ہے۔

اداس کر کے دریچے نئے مکانوں کے
ستارے ڈوب گئے سبز آسمانوں کے 17؎

وہ مسلسل ایک تلاش کے عمل میں ہیں، تلاش احمد مشتاق کی شاعری میں ایک مرکزی موضوع ہے۔جو اُن کے خیالات کی وسعت کو سمیٹے ہوئے ہے۔کبھی تو وہ ذات کی تلاش میں نکلے نظر آتے ہیں تو کبھی محبت کی تلاش میں محوِ سفر نظر آتے ہیں، لیکن سب سے مضبوط تلاش وہ ہے جس میں ایک شہر کی تلاش شہر کے مکان کی تلاش مکان سے منسلک گلیوں، کھڑکیوں اور دریچوں کی تلاش، گلیوں میں بسی آوازوں کی تلاش اور ان مکینوں کی تلاش ہے جن سے یہ مکان آباد تھے۔

گم ہے انھیں گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا

یہ جھانکنا یوں ہی تو نہیں در بدر اپنا 18

بنیادی طور پر یہ تہذیبی آثار سے محرومی کی تلاش ہے جس میں احمد مشتاق اپنے معاصر شعرا سے ہٹ کر اپنا ایک فکری اسلوب بھی بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔وہ گھر کی تہذیب سے ہٹ کر معاشرتی تہذیب کی بات بھی کرتے ہیں۔انھیں زندگی میں دوبار گھر کے در و دیوار چھوڑنے پڑے۔ہجرت کے بعد پاکستان آئے اور یہاں سے پھر بیرونِ ملک چلے گئے۔یہ ایک ایسا جانکاہ تجربہ تھا ان کی زندگی میں جس نے ان کے باطن میں ڈوب کر اظہار کا راستہ اپنایا۔ان کی شعری کائنات اس ہجرت کے درد سے مزئین تو ہے ہی لیکن وہ صرف ہجرت کے نوحہ گر نہیں بلکہ جستجو اور ہمت کے شاعر ہیں جنھوں نے جدیدیت کے ساتھ ساتھ تہذیب کے آثار کو بھی زندہ رکھا۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ ناصر کاظمی، بحوالہ: کاشف مجید، احمد مشتاق ایک مطالعہ، مشمولہ: ماہنامہ، شام و سحر، لاہور: دسمبر 1998ء، ص:26

2۔ نبی احمد، مضمون، احمد مشتاق کی شاعری میں ہجرت کا احساس، مشمولہ: آدمی ہمارا، مرتب مشتاق احمد، لاہور: پیس پبلی کیشنز، 2019ء،: ص219،220

3۔ احمد مشتاق، کلیاتِ احمد مشتاق، الہ آباد: شب خون کتاب گھر، مارچ 2004ء، ص:242

4۔ ضیا فاطمہ، جدید اردو غزل، الہ آباد: اشاعت اول 1995ء، کراؤن آفسٹ پرنٹس، ص:302

5۔ احمد مشتاق، گردِ مہتاب، لاہور: مکتبہ خیال، پہلی اشاعت، فروری 1981ء، ص:63

6۔ احمد مشتاق، کلیاتِ احمد مشتاق، ص:30

7۔ ایضاً، ص:68

8۔ انیس اشفاق، غزل کا نیا علامتی نظام، لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، پہلا ایڈیشن، 2010ء، ص:48،49

9۔ احمد مشتاق، گردِ مہتاب، احمد مشتاق، لاہور: ص:63

10۔ احمد مشتاق، کلیاتِ احمد مشتاق، ص:27

11۔ ایضاً، ص:225

12۔ ایضاً، ص:68

13۔ ایضاً، ص:33

14۔ ایضاً، ص:67

15۔ ایضاً، ص:34

16۔ ایضاً، ص:222

17۔ ایضاً، ص:65

18۔ ایضاً، ص:27

References:

1. Nasir Kazmi, b-hawala: Kashif Majeed, Ahmad Mushtaq: Aik Mutalia, mashmoola: Mahnama Shaam-o-Sehar, Lahore: December 1998, p. 26.
2. Nabi Ahmad, mazmoon, Ahmad Mushtaq ki Shayari mein Hijrat ka Ehsas, mashmoola: Admi Hamara, murattib: Mushtaq Ahmad, Lahore: Peace Publications, 2019, pp. 219–220.
3. Ahmad Mushtaq, Kulliyat-e-Ahmad Mushtaq, Allahabad: Shab-e-Khoon Kitab Ghar, March 2004, p. 242.
4. Zia Fatima, Jadeed Urdu Ghazal, Allahabad: Crown Offset Prints, First Edition, 1995, p. 302.
5. Ahmad Mushtaq, Gard-e-Mahtaab, Lahore: Maktaba-e-Khayaal, First Edition, February 1981, p. 63.
6. Ahmad Mushtaq, Kulliyat-e-Ahmad Mushtaq, p. 30.
7. Ibid., p. 68.
8. Anees Ashfaq, Ghazal ka Naya Alamaati Nizaam, Lucknow: Uttar Pradesh Urdu Academy, First Edition, 2010, pp. 48–49.
9. Ahmad Mushtaq, Gard-e-Mahtaab, Lahore, p. 63.
10. Ahmad Mushtaq, Kulliyat-e-Ahmad Mushtaq, p. 27.
11. Ibid., p. 225.
12. Ibid., p. 68.
13. Ibid., p. 33.
14. Ibid., p. 67.
15. Ibid., p. 34.
16. Ibid., p. 222.
17. Ibid., p. 65.
18. Ibid., p. 27.